تاثرات

خدا کا شکر ہے کہ آج سے ۸، ۹ برس پہلے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے نام سے جس گلستانِ فکر کی بنیاد رکھی گئی تھی اس کی شمیم انگیزیوں نے مغرب کے اہلِ علم کو بھی خاصہ متاثر کیا ہے۔ چنانچہ ہماری کتاب "افکارِ غزالی" پر پیرس کے ایک علمی رسالہ بیلیگرافی آف فیلاسفی نے جس انداز سے تقریظ لکھی ہے اس سے نہ صرف ہماری حوصلہ افزائی ہوئی ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ علمی کام چاہے کتنا ہی خشک کیوں نہ ہو بہرحال اپنا ایک وقیع حلقہ رکھتا ہے۔ اسی طرح ہمارے رفیقِ محترم بشیر احمد صاحب ڈار کی کتاب ریلجس تھاٹ آف سید احمد خاں کی تعریف انگلستان کے ایک معیاری پرچے نے جس نہج سے کی ہے، اس سے ہمیں قلبی خوشی ہوئی ہے۔ اُنہوں نے کتاب کے محتویات کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس موضوع پر انگریزی میں یہ بہترین ادبی کامیابی کے مترادف ہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ خوش کن بات یہ ہے کہ مغرب کے ان علمی حلقوں میں بحیثیتِ مجموعی ادارہ کی کوششوں کو بدرجۂ غایت سراہا جا رہا ہے۔ چنانچہ تقریظ نگار نے اعتراف کیا ہے کہ ادارہ کی مطبوعات اور نتائج قلم اس لائق ہیں کہ فلسفہ، تاریخ اور مذہب سے دلچسپی رکھنے والے دنیا بھر کے اہلِ فکر کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ کیونکہ ان میں جس جرأت، گہرائی اور توازن سے پیش آمدہ مسائل پر غور و فکر کیا گیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

ادارہ کے کیا مقاصد ہیں اور اس کی مطبوعات میں کن بنیادی افکار و عقائد کا خیال رکھا جاتا ہے؟ اس مرحلہ پر یہ بات خود ہمارے اہل وطن کے سمجھنے کی ہے۔ ہمارے سامنے اوّل روز سے یہ مسئلہ رہا ہے کہ موجودہ پود کو اپنے ان تمام ذخائرِ علمی سے روشناس ہونا چاہئے کہ جن سے ماضی میں یورپ نے بھرپور استفادہ کیا اور اپنی تہذیب و ثقافت کو مالا مال کیا۔ یعنی انہیں یقین کے ساتھ معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے اسلاف نے فلسفہ و حکمت کی گتھیوں کو کیونکر سلجھایا۔ یونانی علوم کو کس سادگی کے عالم میں اپنایا اور اس میں کیا کیا گرانقدر اضافے کئے، کس طرح فقہ اور قانون کو عقلی اور سوشل

بنیادوں پر قائم کیا اور کیونکر اس وقت تاریخ و روایت کے تنقیدی اصول وضع کئے۔ جب کہ دنیا سرے سے تاریخ کے علمی تصوّر ہی سے نا آشنا تھی۔

دوسرا مقصد جو ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہا اور جس کے لئے ہم نے پوری ذمہ داری اور اخلاص سے کام کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اُس روشن ضمیر اور پڑھے لکھے گروہ کے لئے ذہنی و قلبی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے، جو مذہب کی پُرانی تعبیر سے مطمئن نہیں ہے۔ اور اس طائفہ کی عنانِ توجہ کو اسلام کی طرف موڑا جائے۔ جو جدید تقاضوں سے واقف ہے اور بڑی حد تک متاثر بھی ہے۔ اور اس طبقہ کو اس دَور کی بولی ٹھولی میں اسلامی حقائق سے بہرہ مند کیا جائے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ فکر و خیال کے پیمانے بدل گئے ہیں۔ اور استدلال و ثبوت کا صغریٰ کبریٰ نئے روپ اور نئی تعبیر کا متقاضی ہے۔ اسی طرح اس گروہ میں اسلام کی محبت و عقیدت کے دواعی کو بیدار کیا جائے، جو اسلام سے وابستہ ہے اور وابستہ رہنا چاہتا ہے، مگر علماء کی کم نگہی، تنگ ظرفی اور ذہنی افلاس کا بے حد شاکی ہے۔ جو اسلام کو ایک متوازن، اصولی اور ابدی اقدارِ حیات کے حامل مذہب کی حیثیت میں دیکھنے کا آرزومند ہے، اور دل سے چاہتا ہے کہ کسی طرف سے روشنی مہیا ہو، اور اس سے وہ اپنے قلب و باطن میں اُجالوں کا اہتمام کرے۔

ادارہ اپنے مضامین اور کتابوں کے ذریعہ اس مقصد میں کس حد تک کامیاب رہا ہے اس کا صحیح صحیح فیصلہ تو قارئین کرام ہی کر سکتے ہیں۔ مگر ہمیں اتنا کہنے کی اجازت دیجئے، کہ ہم نے ان بنیادی خیالات کو بہر حال لکھتے وقت اپنے سامنے رکھا ہے، اور ایک پل بھر کے لئے بھی اس طبقہ کی فکری و روحانی ضروریات ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہونے پائیں۔ کیونکہ تعلیم یافتہ حضرات کی یہ جماعت ہی جو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تربیت حاصل کر کے نکلتی ہے۔ ہمارے نزدیک دراصل توجہ کا استحقاق رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ یہ نوجوان ہیں، اور آئندہ انہیں کو تعمیرِ ملّت اور خدمتِ وطن کا کام سنبھالنا ہے، انہیں کو زندگی کے مختلف گوشوں کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا ہے، اور یہی وہ ہیں آگے چل کر جن کو قیادت و رہنمائی کے اہم فرائض انجام دینا ہے، اور اس اعتبار سے بھی کہ انہی کے فہم و فکر میں موجودہ علوم و فنون کی وجہ سے تبدیلی رونما ہوئی ہے، اس گروہ کی اگر اصلاح ہو جائے، اور ان لوگوں کو اگر یقین دلا دیا جائے، کہ اسلام ایک طاقتور اور ارتقاء پذیر مذہب ہے، اور اس کی نظر میں مسائل و احکام کی ترتیب کا جو نقشہ ہے وہ غیر ضروری قیل و قال پر مبنی نہیں ہے، بلکہ وہ نقشہ زندگی و فکر کی حقیقی لوازم سے تعبیر ہے۔ تو اس کی عقیدت و محبت کا مدار و محور

یقیناً بدل سکتا ہے، اور یہ گروہ پھر سے پورے پورے اخلاص و شیفتگی کے ساتھ اسلام کا خدمت گزار بن سکتا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ ایک طرف تو جدید افکار و خیالات کا طوفان اُمڈ رہا ہے اور دوسری طرف ہمارے علماء یہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ اسلامی علوم و فنون اور مذہب کو کسی نئے پیرایۂ بیان، اور جدید اسلوب تحقیق کی ضرورت بھی ہے۔ اسے محسوس کریں بھی تو کیونکر، جب کہ ان کے ذہنی ماحول میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہی نہیں۔ یہ بے چارے اب تک اسی فرسودہ منطق کو حرفِ آخر سمجھے ہوئے ہیں، جس کی خامیاں ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہو چکی ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ خود قرآن نے جو استدلال و استشہاد کا طریق اختیار کیا ہے وہ سراسر استقرائی (Induction) ہے استخراجی (Deduction) نہیں۔ یہ لوگ نیوٹن اور کوپرنیکس کے ناموں سے محض ناآشنا ہیں۔ اس لئے قدرتاً نہیں جانتے کہ فلکیات کے بارہ میں تمام پرانے تصورات ختم ہو چکے ہیں۔ اور ان کی جگہ بالکل نئے خیالات نے لے لی ہے۔ چنانچہ اب کوئی سمجھ دار آدمی یہ نہیں مانتا کہ افلاک میں روح و نفس کی وجہ سے تحریک ہوئی ہے۔ یا ان کو حرکت میں لانے والے فطرت کے حرکی قوانین نہیں بلکہ عشق ہے۔ طبیعیات کی دنیا میں جو بھونچال آیا ہے اور اس سے جو مابعد الطبعی تصورات متاثر ہوئے ہیں اس کی بھی ایک تاریخ ہے مگر ہمارے علماء اس سے محض ناواقف ہیں اور اب تک ہیولیٰ و صورت کے طلسم میں بُری طرح گرفتار ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ نقطۂ نگاہ کی تبدیلی سے اخلاقیات اور علم الکلام کے کتنے ابواب یکسر بدل جاتے ہیں۔

اسی طرح علماء کا یہ گروہ سوسائٹی اور معاشرہ میں کیا بنیادی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں اور ان تبدیلیوں نے کتنے نئے مسائل پیدا کر دئے ہیں اور کتنی نئی الجھنوں کو جنم دیا ہے اس سے بھی بالکل ناآشنا ہیں۔ ان حالات میں یہ توقع بالکل بے کار ہے کہ یہ حضرات جو اس پرانی فضا اور آب و ہوا میں رہ رہے ہیں، موجودہ دور میں کوئی مفید کام کر سکیں گے، اور موجودہ اصطلاحوں میں نئی پود کے دلوں میں اسلامی حقائق کو اُتار سکنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

اس سلسلہ کی سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ علماء کے ذہن میں مذہب کا جو تصور ہے اسمیں اور زندگی کے حقیقی مسائل میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ بلکہ بسا اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مذہب گویا اور روزمرہ کی الجھنوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ علماء جن مسائل پر زور دیتے

ہیں، اور جن مسائل کو فکر و نزاع کا ہدفِ اعلیٰ ٹھہراتے ہیں، نفسِ زندگی کے لحاظ سے دیکھئے تو ان کی افادیت ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ان حالات میں ادارہ نے کام شروع کیا اور چاہا کہ علماء سے تعرض کئے بغیر اور بحث و مناظرہ میں وقت ضائع کئے بنا جدید طبقہ کی ضروریات کو سامنے رکھ کر ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو ان کی ذہنی تشنگی کو دور کر سکے جو اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کو اُجاگر کرے، اور موجودہ تبدیلیوں کے پیشِ نظر اسلام کی سچی تلی، جاذب اور سلجھی ہوئی تعبیر پیش کر سکے۔ علاوہ ازیں جو زمرہ کے معاشرتی مسائل کو حل کر سکے اور بتا سکے کہ جس زندگی سے ہم دوچار ہیں اس میں اسلام ہمیں کیا ہدایات دیتا ہے۔

کچھ اسی نوع کے حالات اور مجبوریوں کا احساس سرسیّد مرحوم کو بھی تھا، جس کے پیشِ نظر اُنہوں نے احیاءِ اسلام ایسی بہت بڑی تحریک کی طرح ڈالی۔ ہم قارئین سے پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ ڈار صاحب کی اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔ اس سے ایک طرف تو سرسید کے عظیم فکری و اصلاحی کارناموں کا پتہ چلے گا اور دوسری طرف ہمارے ادارہ کے کام کی اہمیّت کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ اور یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس کو کیوں قائم رہنا چاہیئے۔ یعنی یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سرسید مرحوم نے فکری اور دینی اصلاح کے سلسلہ میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے، اور کس حد تک اس کام کو نسبتہً زیادہ معقول، متوازن اور صحت مندانہ صورت میں آگے بڑھانا باقی ہے۔

(محمد حنیف ندوی)